جنگ آزادی کی تحریکات اور ان کے نتائج

The Movement of the War of Independence and their Consequences

Iqra Ashraf
MPhil Scholar, Institute of Islamic Studies,
Bahauddin Zakaria University, Multan
Email: tahirbloch901@gmail.com
Hafiz Hamood Ur Rehman
MPhil Scholar, Institute of Islamic Studies,
Bahauddin Zakariya University Multan
Email: hafizhamood9@gmail.com

Abstract:
The struggle for freedom has remained a central theme in human history, reflecting the innate desire of nations to live with dignity, sovereignty, and cultural identity. Wars of independence, whether in Asia, Africa, Europe, or Latin America, emerged as collective responses against colonial domination, political oppression, and economic exploitation. These movements were not confined to armed resistance alone; they also encompassed political mobilization, intellectual awakening, and social transformation. The War of Independence in 1857 serves as a significant example, where both Hindus and Muslims stood united against British imperialism. Although the movement did not achieve immediate success, it ignited the spirit of nationalism that later culminated in the formation of independent states, including Pakistan. Similar struggles across the globe—such as the American Revolution, the liberation of African states, and the anti-colonial movements in the Arab world—reshaped the international order. The outcomes of these independence movements were far-reaching. Politically, they dismantled colonial structures and gave rise to nation-states. Socially and culturally, they revived indigenous traditions, languages, and religions. Economically, they laid the foundation for self-reliance, though often after severe losses in resources and human lives. On the international level, these struggles legitimized the principle of self-determination, later recognized in international law and the United Nations Charter. In conclusion, wars of independence were not merely historical episodes but turning points that redefined global politics and human values. Despite immense sacrifices, they proved that freedom is the most precious possession of nations and that no power can permanently suppress the collective will of a people determined to achieve sovereignty.

Keywords: Hindus, Muslims, American Revolution, anti-colonial movements

مقدمہ

انسانی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ آزادی اور خود مختاری ہر قوم کی فطری خواہش رہی ہے۔ جب بھی کسی قوم پر جبر و استبداد، غلامی یا غیر ملکی تسلط مسلط کیا گیا تو اس قوم نے اپنی شناخت، ثقافت، مذہب اور وقار کو محفوظ رکھنے کے لیے جدوجہد کی۔ یہی جذبہ آزادی، وقت کے ساتھ ساتھ مختلف تحریکات کی صورت میں ابھر تا رہا ہے جنہیں ہم جنگِ آزادی یا تحریکِ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ تحریکات محض سیاسی جدوجہد کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ ان میں عوامی شعور، فکری بیداری، مذہبی غیرت اور معاشرتی انصاف کا گہرا تاثر کارفرما تھا۔ قومیں جب محکومیت کے اندھیروں میں جکڑی گئیں تو انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور آزادی کو اپنا نصب العین بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں، خواہ وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ رہیں، محکوم اقوام کی آزادی کی تحریکات کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکیں۔

جنگِ آزادی کی تحریکات کا دائرہ صرف کسی ایک خطے تک محدود نہیں رہا بلکہ دنیا کے مختلف خطوں میں یہ تحریکات مختلف ادوار میں ظہور پذیر ہوئیں۔ ایشیا سے لے کر افریقہ تک اور یورپ سے لے کر لاطینی امریکہ تک، محکوم اقوام نے نوآبادیاتی قوتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ ان تحریکات میں کبھی ہتھیار اٹھائے گئے، کبھی سیاسی و سفارتی محاذ پر لڑائی لڑی گئی اور کبھی علمی و فکری محاذ پر جدوجہد کی گئی۔ ان تحریکات کا بنیادی مقصد ہمیشہ ایک ہی رہا: غلامی کی زنجیروں کو توڑنا اور قومی خود مختاری کا حصول۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی مثال لی جائے تو یہ برصغیر کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کو اگرچہ بغاوت کا نام دیا گیا، لیکن درحقیقت یہ برصغیر کے عوام کی انگریز سامراج کے خلاف پہلی بڑی منظم اور مشترکہ کوشش تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آئے، اپنے جان و مال کی قربانیاں دیں اور یہ اعلان کیا کہ غلامی کسی صورت قبول نہیں۔ اگرچہ یہ تحریک بظاہر کامیابی حاصل نہ کر سکی، لیکن اس نے ہندوستان کے عوام کے دلوں میں آزادی کا چراغ روشن کر دیا، جس کی روشنی آگے چل کر تحریکِ پاکستان اور بالآخر قیامِ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اسی طرح دنیا کے دیگر خطوں میں بھی آزادی کی جدوجہد نے وقت گزرنے کے ساتھ مختلف سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات مرتب کیے۔

آزادی کی تحریکات کے نتائج صرف سیاسی خود مختاری تک محدود نہیں رہے، بلکہ انہوں نے محکوم اقوام کی ذہنی اور فکری زندگی پر بھی گہرے اثرات ڈالے۔ آزادی نے انہیں اپنی زبان، ثقافت اور مذہب کو دوبارہ زندہ کرنے کا موقع دیا۔ قومی وحدت کو فروغ ملا، عوام میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور غلامی کے طویل

اندھیروں کے بعد ترقی و خوشحالی کی نئی راہیں کھلیں۔ بسا اوقات یہ تحریکات خونریزی اور قربانیوں کے طویل سلسلے کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہوئیں، اور بعض اوقات یہ جدوجہد نسل در نسل جاری رہی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہر قربانی نے آنے والی نسلوں کے لیے آزادی کے دروازے کھولے اور محکوم قوموں کو اس بات کا احساس دلایا کہ آزادی محض ایک حق نہیں بلکہ انسان کی سب سے بڑی متاع ہے۔

جنگِ آزادی کی تحریکات کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کے سیاسی نقشے کو بدل کر رکھ دیا۔ ان تحریکات کے نتیجے میں نوآبادیاتی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا، سامراجی قوتوں کی گرفت کمزور پڑی اور نئی قومی ریاستوں نے جنم لیا۔ ان تحریکات نے عالمی سیاست میں "قوموں کے حقِ خودارادیت" کو ایک مسلمہ اصول کے طور پر منوایا، جسے بعد ازاں بین الاقوامی قوانین اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں بھی شامل کیا گیا۔ اس طرح آزادی کی تحریکات نے نہ صرف محکوم اقوام کو آزادی دلائی بلکہ عالمی سطح پر بھی ایک نئے سیاسی و قانونی شعور کو جنم دیا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جنگِ آزادی کی تحریکات بغیر قربانیوں کے کامیاب نہیں ہوئیں۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں نے اپنی جانیں قربان کیں، بے شمار خاندان اجڑ گئے، معیشتیں تباہ ہوئیں اور معاشرتی ڈھانچے بگڑ گئے۔ لیکن ان سب نقصانات کے باوجود ان تحریکات نے جو نتائج پیدا کیے وہ ان قربانیوں سے کہیں زیادہ قیمتی اور دوررس ثابت ہوئے۔ آزادی کی برکت سے قومیں دوبارہ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہوئیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک آزاد اور باوقار مستقبل کی بنیاد رکھی۔

لہٰذا جنگِ آزادی کی تحریکات محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ یہ انسانی حریت، خودداری اور وقار کی زندہ علامت ہیں۔ یہ تحریکات اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ قومیں غلامی کو ہمیشہ عارضی حیثیت دیتی ہیں اور آخرکار آزادی کی صبح طلوع ہو کر رہتی ہے۔ ان کے نتائج نہ صرف ماضی میں آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئے بلکہ آج بھی دنیا بھر کی اقوام کے لیے مشعلِ راہ ہیں کہ ظلم، جبر اور غلامی کے اندھیروں میں بھی اگر عزم پختہ ہو تو آزادی کی منزل حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ آزادی کی تحریکات اور ان کے نتائج کا مطالعہ صرف ایک تاریخی ضرورت نہیں بلکہ عصرِ حاضر کے لیے ایک فکری و عملی رہنمائی بھی ہے۔

تحریک آزادی میں علمائے کرام کی جدوجہد و قربانی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی تحریک اس وقت شروع ہوئی، جب ہندوستان کی آزادی کے لیے ملک میں کوئی دوسری تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں، قید وبند کی تکلیفیں برداشت کیں، پھانسیاں دی گئیں، کالا پانی بھیجے گئے۔ اس تحریک میں خود حصہ لیا۔ برادران وطن کو دعوت دی اور ان کے ساتھ مل کر ملک کو آزاد کرانے میں پیش پیش

رہے۔ ان حضرات نے ملک کی آزادی کے لیے بہت سی تحریکیں بھی چلائیں اور بہت سی تنظیمیں قائم کیں، جن کا ملک کی آزادی میں اہم رول رہا ہے۔ ان تحریکوں میں سے ریشمی رومال تحریک بہت مشہور ہے۔

قونصل جنرل برطانیہ کے ذریعہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں موصول ہوئے ٹیلی گرام میں ریشمی خطوط کا خلاصہ موجود ہے۔ اس میں تحریر ہے زیر نظر کیس کو ہم اپنی آسانی کے لیے "ریشمی خطوط کا کیس" اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس بارے میں ہمیں گہری اور مکمل واقفیت اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے "تین خطوط" کے پکڑے جانے سے حاصل ہوئی جو کابل میں موجود سازشیوں نے حجاز میں موجود سازشیوں کو بھیجنے کے لیے روانہ کیے تھے۔ یہ واقعات جو اس تفتیش اور تحقیقات کا باعث ہیں۔ ان کا سلسلہ ۱۹۱۵ء کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ ریشمی رومال تحریک کی سیاسی اہمیت بھی ہے اور تاریخی بھی اس تحریک کا ملک کی آزادی میں اہم رول ہے۔ اس کی قیادت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کی۔[1]

شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد محترم کا نام مولانا ذوالفقار علی تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۸۵۱ء کو بریلی میں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں سلسلہ تعلیم شروع ہوا۔ ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے کی۔ آپ سفر و حضر میں حضرت استاذ کے ساتھ رہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد معین مدرس بنائے گئے۔ اور چار سال کے بعد دارالعلوم دیوبند میں مدرس چھارم قرار دیے گئے۔ پھر ۱۸۸۸ء میں صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز کے گئے۔ جس کے فرائض ۱۹۱۵ء تک انجام دیتے رہے۔[2]

دار العلوم میں مدرس کی حیثیت سے تقرر کو پانچ سال ہوئے تھے کہ آپ نے دارالعلوم ہی کے حلقہ میں ایک جماعت بنائی "ثمرۃ التربیت" اس کا نام تجویز کیا۔ دارالعلوم کے مالی مفاد کے لیے فضلاء اور ہمدردان دارالعلوم سے رابطہ رکھنا اس جماعت کا مقصد ظاہر کیا گیا، مگر ظاہر ہے کہ جملہ مقاصد کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاتا۔

۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں نظارۃ المعارف کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی تھے اور روح روان حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن یہ تعلیم گاہ بھی تھا۔ تربیت گاہ بھی اور خفیہ مشورہ گاہ بھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تحریر کرتے ہیں۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو بے دینی اور زہریلا اثر پڑتا ہے اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک و شبہات دین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں۔

ساتھ ہی اس کا مقصد سیاسی بھی تھا۔ سی آئی ڈی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

"دیوبند کو اپنے مشنریوں کی تربیت گاہ نہ بنا سکا تو عبید اللہ نے فیصلہ کیا کہ ایک مدرسہ دلی میں اس مقصد کے لیے قائم کرے۔ اس میں درس کے علاوہ جو نظارۃ المعارف میں دیا جاتا تھا وہ صریحاً درست نہیں تھا یہ سازشوں کے لیے وقتاً فوقتاً مل بیٹھنے کے لیے ایک جلسہ گاہ بھی تھا۔"[3]

۱۹۱۳ء میں عالمی جنگ چھڑ جانے کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن نے محسوس کیا کہ وقت قریب آگیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ شروع کی جاسکتی ہے۔ حضرت شیخ الہند نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستانی عوام اور مشرق وسطی کے ممالک خصوصاً افغانستان ایران اور خلافت عثمانیہ کو متحد کے بغیر برطانوی حکومت سے ایشیاء کو آزاد نہیں کرایا جاسکتا ہے۔ اس وقت خلافت عثمانیہ مشرق وسطی کے وقار کی محافظ سمجھی جاتی تھی اور ترکی ہی برطانیہ، اٹلی، فرانس یونان اور روس کے مقابلہ میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس لیے آپ نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان جانے کا حکم دیا اور خود حجاز و خلافت عثمانیہ کا سفر کیا۔

۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا، مگر انھیں کوئی مفصل پروگرام نہیں دیا۔ سی آئی ڈی کو غفلت میں ڈال کر شیخ عبد الرحیم سندھی کے ساتھ کوئٹہ ہوتے ہوئے افغانستان کے لیے روانہ ہوگئے۔[4]

شیخ عبد الرحیم سندھی جنہوں نے اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا یہ بھی حضرت شیخ الہند کی تحریک کے معتمد تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان جانے کے لیے ان کی بیوی اور بیٹیوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے زاد راہ کی فراہمی کی تھی، روانگی کے وقت شیخ عبد الرحیم کوئٹہ تک گئے اور وہاں جا کر روپے سپرد کر کے واپس لوٹ آئے۔

گرفتاری سے بچنے کے لیے مولانا سندھی بلوچستان کے ریگستان اور سنسان پہاڑی راستوں اور دروں سے ہوتے ہوئے ۱۵ اگست ۱۹۱۵ء کو افغانستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ افغانستان کی آزاد سرزمین پر انھوں نے پہلی مغرب کی نماز ادا کی۔ اور حسن اتفاق یہی ۱۵ اگست ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہوئی۔[5]

مولانا عبید اللہ سندھی تحریر کرتے ہیں

"۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا

راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ روانگی کے وقت دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے، انھوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندہ تھے، اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا، اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں اس وقت سے میں کانگریس کا داعی بن گیا ۱۹۲۳ء میں امیر امان اللہ خان کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریسیڈنٹ ہوں"[6]

افغانستان کے جس علاقہ میں مولانا سندھی داخل ہوئے اس علاقہ کو "سوریایک" کہا جاتا ہے۔ حضرت مولانا وہاں سے قندھار پہنچے۔ وہاں سے کابل پہنچے۔ ان کے سفر کا مقصد تھا افغانستان کو ہندوستان کی تحریک آزادی میں اخلاقی اور فوجی امداد دینے کے لیے تیار کرانا۔ مولانا اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا اوران کی مدد سے امیر حبیب اللہ تک رسائی حاصل کی۔ اور اپنے مقصد سفر کے سلسلہ میں ایک عرض داشت پیش کی جس میں افغانستان کو ہندوستان کی آزادی کے لیے امداد دینے کی درخواست تھی۔[7]

مولانا سندھی کے کابل پہنچنے سے پہلے پنجاب اور سرحد کے انگریزی کالج کے طلبہ کا ایک وفد بھی کابل پہنچ چکا تھا۔ جہاں ان کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ طلبہ کے اس وفد کا مقصد تھا خلافت عثمانیہ کی فوج میں شامل ہو کر انگریزوں سے لڑنا۔ ان طلبہ کو مولانا سندھی نے کابل پہنچنے کے بعد رہا کرایا تھا۔ مولانا سندھی نے ان مہاجر طلبہ کو اپنے حلقہ میں شامل کر لیا ان کو مشورہ دیا کہ وہ ترکی فوج میں شامل ہونے کا ارادہ ترک کر دیں اور افغانستان ہی میں رہ کر ہندوستان کی

آزادی کے لیے کام کریں چنانچہ وہ طلبہ تیار ہوگئے اوران کے ساتھ مل کر مولاناسندھی نے ایک عارضی حکومت قائم کی۔ اس عارضی حکومت کے تین رکن تھے۔ راجہ مہندر سنگھ مولانا برکت اللہ بھوپالی اور مولانا عبید اللہ سندھی اس عارضی حکومت نے مختلف ممالک میں اپنے وفود روانہ کرکے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلہ میں مارچ ۱۹۱۶ء کو ایک وفد روس بھیجا گیااس کے بعد دووفد کو ترکی اور جاپان کے لیے روانہ کیا گیا۔ ترکی جانے والے وفد میں عبد الباری اور شجاع اللہ اور جاپان جانے والے وفد میں شیخ عبد القادر اور ڈاکٹر متھر اسنگھ شامل تھے۔ جاپان جانے والے وفد کو گرفتار کرکے روسی حکام نے برطانیہ کے حوالے کردیااور بد قسمتی سے ترکی جانے والا وفد بھی برطانوی حکام کے قبضہ میں آگیا۔ ان کے بیانات سے سارے واقعات انگریزوں کے علم میں آگئے۔ حکومت برطانیہ نے حکومت افغانستان سے احتجاج کیا، جس کے دباؤ میں آکر حکومت افغانستان نے مولوی محمد علی اور شیخ ابراہیم کو ہندوستان جانے کا حکم دے دیا۔ یہ دونوں حبیبیہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر تھے۔[8]

مولانا عبید اللہ سندھی نے ان حالات سے حضرت شیخ الہند کو مطلع کرناضروری سمجھااور ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر خط لکھ کر ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو عبد الحق کو دیااور اس کو ہدایت کردی کہ یہ خطوط شیخ عبد الرحیم سندھی کو پہنچادیں، ریشمی رومال کے اس خط کو "ریشمی رومال تحریک" یا "ریشمی خطوط تحریک" کہتے ہیں۔ یہ خطوط کیسے ہاتھ لگے، اس سلسلہ میں ریشمی خطوط سازش کیس میں آفیسر ان کی تحریر ملاحظہ ہو۔

> "۱۴ اگست کو ملتان کے خان بہادر رب نواز خان نے ملتان ڈویژن کے کمشنر کو زرد ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑے دکھائے جن پر خوش خط اردو لکھی تھی۔ انھوں نے بیان کیا کہ یہ ۴ اگست سے ان کے پاس تھے لیکن کمشنر کی عدم موجودگی کے باعث پیش نہیں کیے جاسکے۔ خان بہادر نے بتا کہ انھیں یہ خطوط عبد الحق سے ملے ہیں، جو پہلے ان کے لڑکوں کا اتالیق تھا اور ۱۹۱۵ء میں ان کے ہمراہ کابل گیا تھا۔ عبد الحق نے رب نواز خان کو یہ خطوط پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ان خطوط کو پہنچانے کے لیے ہی اس کو کابل سے بھیجا گیا ہے جو حیدرآباد سندھ میں عبد الرحیم کو دیے جاتے تھے تا کہ وہ ان خطوط کو مدینہ روانہ کردے عبد الحق کو عبد الرحیم سے ان خطوط کی رسید لینی تھی اور اس رسید کو واپس کابل لے جاناتھا"

کمشنر ملتان نے اس خط کے بعض حصے پڑھوا کر سنے اور انھیں بچوں کی سی حماقت قرار دیا تاہم ان خطوط کو پنجاب سی آئی ڈی کے حوالہ کر دیا گیا پنجاب سی آئی ڈی کے مسٹر ٹومکس نے ان خطوط کا ترجمہ کرایا اور عبد الحق قاصد پر جرح کرائی۔

انگریز آفیسر ان خطوط کی تحریر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> "ان خطوط کی تحریر بہت اچھی نہایت صاف اور پختہ ہے نہ تو کوئی لفظ کھرچ کر صاف کیا گیا ہے، نہ کہیں کچھ مٹایا گیا ہے، نہ کسی لفظ کی اصلاح کی گئی ہے۔ صرف و نحو کی صرف ایک نہایت معمولی غلطی پوری تحریر میں نظر آتی ہے خط کی زبان اگرچہ بعض مقامات پر مبہم ہے جیسا کہ بالعموم سازشی تحریروں میں ہوتی ہیں لیکن اچھے تعلیم یافتہ بلکہ عالم شخص کی زبان ہے"[9]

مولانا عبید اللہ سندھی نے جو ریشمی رومال پر خطوط لکھے تھے تاریخی اور سیاسی اعتبار سے وہ خطوط نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے پہلا خط شیخ عبد الرحیم سندھی کے نام تھا۔ یہ خط ۶ انچ لمبے اور ۵ انچ چوڑے ٹکڑوں پر لکھا گیا تھا۔ دوسرا خط حضرت شیخ الہند کے نام تھا۔ یہ خط دس انچ لمبے اور آٹھ انچ چوڑے کپڑے کے ٹکڑے پر لکھا گیا تھا۔ تیسرا خط ۱۵ انچ لمبے اور دس انچ چوڑے ٹکڑے پر لکھا گیا تھا یہ خط شیخ الہند کے نام تھا۔ ریشمی خطوط سازش کیس میں ان خطوط کے سلسلہ میں تفصیل درج ہے، وہ یہ ہے:

یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر ہیں، ان میں پہلا خط شیخ عبد الرحیم صاحب کے نام ہے۔ یہ ٹکڑا چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا ہے۔ دوسرا خط مولانا کے نام ہے یہ دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ہے۔ تیسرا خط بظاہر پہلے خط ہی کے تسلسل میں ہے۔ پندرہ انچ لمبا اور دس انچ چوڑا ہے۔[10]

پہلے اور تیسرے خطوط پر "عبید اللہ" دستخط ہیں۔ عبد الحق نے ہمیں بتایا ہے کہ مولوی عبید اللہ نے اس کو یہ تینوں ریشمی رومال دیے ہیں۔ جن پر اس کی موجودگی میں مولوی عبید اللہ نے خطوط لکھے تھے۔

اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ عبید اللہ نے خود ہی یہ خط لکھے تھے۔ عبید اللہ نام کے دستخط عبید اللہ کے ان دستخطوں سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ جو یہاں ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

ریشمی رومال تحریک جنگ آزادی ہند کا ایک سنگ میل

ہندوستان حصول آزادی کی منزل سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمکنار ہوا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہندوستانیوں کو مختلف تحریکات کے سخت اور صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑا۔ برطانوی تسلط کے دور میں ہندوستانی عوام

بیرونی حکومت کے خلاف برابر علم بغاوت بلند کرتے رہے جسے کچلنے کے لئے انگریز حکمرانوں نے ظالمانہ اور جابرانہ رویہ اختیار کیا۔ اگرچہ انگریزوں نے آزادی کے متوالوں کی کوششوں اور تحریکوں کو اپنے مظالم سے دبانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ ان وطن پرستوں کے جوش اور ولولے اور حوصلہ و ہمت کو نہیں دبا سکے۔ ہندوستان کے جیالے عوام اپنی آزادی کے لئے مسلسل سر بکف رہے اور بالآخر انھوں نے وطن عزیز کو آزاد کرا کے دم لیا۔[11]

غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہمارے ملک میں جو تحریکیں اُٹھیں ان میں ریشمی رومال تحریک سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ اس تحریک کے سربراہ کوئی جدید تعلیم یافتہ فرد نہیں تھے، وہ ایک جید عالم مصلح اور مفکر تھے جن کے نظریات شاہ ولی واللہ سے ملتے تھے اور جنھوں نے اپنے بزرگ رفیق مولانا رشید احمد گنگوہی کی سیاسی بصیرت کی روشنی میں ہندوستان میں سیکولر نظریات کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ تحریک انگریزی سامراجیت کے خاتمہ کے لئے ایک زبردست لیکن ناکام کوشش تھی۔ ظاہر ہے انگریز اسے قومی تحریک کا درجہ کیوں دیتے، اس لئے اسے ایک سازش کا نام دے کر قانونی کارروائی کا جواز پیدا کیا۔ ان کے ریکارڈ میں یہ ریشمی خطوط سازش کیس کے نام سے درج ہے لیکن حقیقتاً یہ آزادی کی ایک تحریک تھی اور اس قدر زبردست کہ اسے جنگ آزادی ہند کے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔[12]

ریشمی رومال تحریک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم شیخ الہند مولانا محمود حسن نے شروع کی تھی۔ قاضی محمد عدیل عباسی رقم طراز ہیں:

> مولانا محمود حسن نے تمام عالم اسلامی میں انقلاب بپا کرنے کا منصوبہ بنایا وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز نے اپنا جال تمام دنیا میں پھیلا رکھا ہے، جس کا نتیجہ ایک طرف تو ہندوستان کی غلامی ہے اور دو دوسری جانب خلافت مرکزیہ اور بلادِ اسلامیہ کی تباہی و بربادی۔ اس لئے مولانا نے ایک طرف توہندوستان میں ایک متحدہ آزاد جمہوریت بنانے کا ارادہ کیا اور دوسری جانب بلادِ اسلامیہ کی حفاظت و بقا کا پروگرام بنایا اور دونوں کے لئے انگریز سے جنگ لازمی تھی۔[13]

مولانا محمود حسن نے انگریزوں سے جنگ کرنے اور ان کی حکومت کے خاتمے کے لئے یہ تحریک شروع کی تھی۔ حالانکہ تحریک کے بانی مولانا محمود حسن تھے لیکن انگریزوں نے کی۔ آئی ڈی کی رپورٹ کی بنیاد پر اس تحریک کا بانی مولانا عبید اللہ سندھی کو قرار دیا تھا جو کہ غلط ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو مولانا محمود الحسن نے

تربیت دیگر اس تحریک کا بے حد اہم رکن بنا دیا تھا جس کی وجہ سے غالبا سی۔ آئی۔ ڈی نے پہلے انھیں کو اس تحریک کا بانی سمجھا تھا۔ سرگرمیاں برائے نام تھیں اور ملک کے حالات بھی اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی تیز تحریک شروع کی جائے۔ چونکہ اس تحریک کے کارکنوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی اور انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا اصل ذمہ دار مسلمانوں ہی کو قرار دیا تھا اس لئے اس کی کارروائیاں نہایت خفیہ طریقے پر ہوتی تھیں اور اس کا ممبر بھی لوگوں کو بنایا جاتا تھا جن کے بارے میں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ وہ وطن عزیز کی آزادی اور اس کی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس دلانے کیلئے ہر قسم کی تکلیف اور پریشانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ خفیہ طور پر کام کرنے کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب اور پنجہ غضب سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینے اور غاصب حکمرانوں سے اپنا ملک واپس لینے کی یہ پہلی منظم کوشش تھی۔ مولانا محمود حسن نے اس سلسلہ میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کب سے کیا اس کے متعلق مولانا عبید اللہ مرحوم کی ڈائری ترتیب دینے والے نے دیباچے کے صفحہ ۳ پر لکھا ہے۔

> "....مولانا شیخ الہند کی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی تھیں اور اس لمبے پروگرام کا جزو تھیں جسکو مولانا عبید اللہ سندھی شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں جنگ عظیم سے پہلے دو اجزا پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ اندرون ہند اور بیرون ہند جنگ عظیم کے دوران میں انھیں سرگرمیوں کو موقعہ کے مناسب پھیلایا گیا اور ہندوستان میں داخلی بغاوت اور اس پر خارجی حملے کے ذریعہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کی تدبیر سوچی گئی۔"[14]

اس تحریک کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان کے راستے سے ترکی کی فوجیں ہندوستان پر حملہ کریں گی اور اس کے ساتھ پورے ملک کے مسلمان علم بغاوت بلند کر کے ملک کو آزاد کرالیں گے۔ چونکہ مسلمانان ہند نے مختلف جنگوں میں ترکان احرار کی مدد کی تھی اس لئے انھیں اس بات کا یقین تھا کہ ترکی ملک کو آزاد کرانے میں یقینا امداد بہم پہنچائے گا۔

اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے جو پروگرام بنائے گئے ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسکیم کتنی حکمت عملی اور کتنے شعور مرتب کی گئی تھی۔ کابل میں آزاد ہندوستان کی پہلی عارضی حکومت قائم کی گئی، جس

کے صدر راجہ مہندر پر تاپ، وزیر اعظم بر کت اللہ اور ویز ر داخلہ عبید اللہ سندھی تھے۔ روس، چین، برما، جاپان، فرانس اور امریکہ مشن روانہ کئے گئے تا کہ ان سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے انگریزوں کے خلاف اپنا اتحادی بنایا جائے۔ اور رائے عامہ کو عالمی سطح پر ہموار کر کے ان تمام ممالک کو ہندوستان کی آزادی کا حمایتی بنایا جائے، اور انھیں ترکی کی مدد کرنے کے لئے راضی کیا جائے۔ جب بیرون ملک سے امداد اور حمایت کا یقین ہو جائے تو پورے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ملک کو آزاد کرا لیا جائے۔ ڈاکٹر متھر اسنگھ، خوشی محمد اور دو کابلی ملازمین آیا سنگھ کابلی اور عبد الحق کابلی پر مشتمل وفد روس روانہ ہوا۔ چین اور برما کے وفد کی قیادت مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور شوکت علی نے کی۔ جاپان کے وفد کی سربراہی کے فرائض برکت اللہ بھوپالی نے ادا کئے۔ فرانس کے وفد کی قیادت کی ذمہ داری چودھری رحمت علی پنجابی کو سونپی گئی اور ہر دیال امریکہ کا وفد لے کر گئے۔[15]

حکومت کی پالیسی اور ارادوں کی خبر تحریک کے ممبران تک پہنچانے کی غرض سے ڈاکٹر انصاری کی مدد سے بہت سے ہندو اور مسلمان افراد کو سی، آئی، ڈی میں داخل کرایا گیا۔ حملہ آوروں کو سہولیات مہیا کرانے کا کام عبید اللہ سندھی کو سونپا گیا۔ بغاوت کے لئے آٹھ خفیہ مراکز لاہور، کراچی، پانی پت، رانذیر (گجرات) عثمان زئی (سرحدی صوبہ، دیناج پور (ریاست بہاولپور)، ترنگ زئی (آزاد قبائل) اور امروٹ (سندھ) میں قائم کئے گئے اور ان کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں بنایا گیا۔ اس کے علاوہ "مخلصین" کے نام کی ایک خفیہ جماعت قائم کی گئی جس کا کوڈ ورڈ مخلص تھا۔ یہ لفظ صرف جماعت کے ارکان کیلئے مخصوص تھا۔ ہندوستان کے باہر کارروائیوں کا مرکز یاغستان کو بنایا گیا جو شمالی مغربی سرحد پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اس تحریک میں حالانکہ مسلمان بہت بڑی تعداد میں شریک تھے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس میں غیر مسلموں نے شرکت نہیں کی تھی۔ راجہ مہندر پر تاپ، ڈاکٹر متھر اسنگھ، کالا سنگھ، ہرنام سنگھ وغیرہ وہ غیر مسلم حضرات تھے جن کا شمار تحریک کے سرگرم کارکنوں میں ہوتا تھا۔ پنجاب کے سکھوں اور بنگال کے انقلابی پارٹی کے ممبروں سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ وہ بغاوت میں معاونت کریں۔ ان لوگوں کے ٹھہرنے کے لئے ایک مکان بھی کرایہ پر لیا گیا تھا۔ ان کی خدمت اور اُن کے کھانے پینے کا انتظام ان کے مذاق کے مطابق خدام کیا کرتے تھے۔

ابھی شیخ الہند اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے پروگرام ہی بنا رہے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ غلام رسول مہر رقم طراز ہیں:

"ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھا سکے تھے کہ پہلی جنگ یورپ شروع
ہو گئی۔ دو تین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے

گویا اطمینان و دلجمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو فی الفور کیا جائے تا کہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو، ترکوں کو تقویت پہنچے اور ہندوستان کی آزادی کا خواب اپنی صحیح تعبیر سے ہم آغوش ہو جائے۔"

دیو بند میں فوراً خفیہ نشستیں ہوئی جس میں یہ طے ہوا کہ ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو بیرونی حملے کے ساتھ پورے ملک میں بغاوت شروع کی جائے گی۔[16]

جنگ آزادی کے نتائج

دہلی کی فتح کے بعد انگریز فوجوں نے شہری آبادی سے خوف ناک انتقام لیا۔لوگوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ سینکڑوں کو پھانسی پر چڑھادیا گیا۔ ہزاروں نفوس گولیوں سے اڑادیے گئے۔ ان میں مجرم بھی تھے اور بے گناہ بھی۔ مسلمان بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اور ہندو بھی۔ لیکن جلد ہی انگریزی فوج کے سکھ سپاہیوں نے قتل و غارت میں فرقہ وارانہ رنگ بھر دیا۔ مسلمان چن چن کر قتل کیے گئے۔ بہت سے مقتدر اور متمول مسلمانوں کی جائیدادیں تباہ ہو گئیں۔ اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ ان ہولناک مظالم کا اعادہ ان مقامات پر بھی کیا گیا جہاں اولاً جنگ کی آگ بھڑکی تھی۔

اگست ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے اعلان ملکہ وکٹوریہ کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ کر کے ہندوستان کو تاج برطانیہ کے سپرد کر دیا۔[17]

اس جنگ کے بعد خصوصاً مسلمان زیر عتاب آئے۔ جب کہ ہندوؤں نے مکمل طور پر انگریز سے مفاہمت کر لی۔ یوں مسلمانوں پر جدید علم کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اور خود مسلمان بھی نئی دنیا سے دور ہوتے چلے گئے۔ ایسے میں سرسید جیسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے اس جنگ آزادی کے وجوہات پر روشنی ڈالی اور انگریزوں پر زور دیا کہ ہندوستانیوں میں موجود احساس محرومیوں کو دور کر کے ہی انگریز یہاں حکومت کر سکتا ہے۔ سرسید نے مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب لانے کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔

اس جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان مل کر ہندوستان کے لیے لڑے لیکن اس کے بعد انگریز کی سازش اور کچھ ہندوؤں کے رویے کی وجہ سے مسلمان اور ہندو الگ الگ قوموں کی صورت میں بٹ گئے۔ یوں پہلی مرتبہ دو قومی نظریے کی بنیاد پڑی۔[18]

ہندو اور مسلمان طویل سیاسی اور تہذیبی مقاصد میں ہمیشہ سے الگ الگ رہے ہیں لیکن بیرونی غلبے سے آزادی حاصل کرنا ایسا جذبہ تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ اس موقعہ پر جو نقطۂ اتحاد دونوں قوموں کے لئے قابل قبول ہو سکتا تھا وہ مغل شہنشاہ کی ذات تھی مانا کہ مغل بادشاہ کا وجود اب برائے نام تھا لیکن اس کی قانونی حیثیت اب بھی مسلم تھی۔ مزید بر آں عوام کی وفاداری کی دیرینہ روایات بھی مغل خاندان سے وابستہ تھیں۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر قیادت کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں کی نظریں مغل شہنشاہ پر پڑیں۔ لیکن ملک کی سیاسی بے چینی ابھی منظم تحریک کی پختہ صورت نہ اختیار کر پائی تھی کہ فوج میں بغاوت کی چنگاری اٹھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شعلے کی شکل میں برصغیر کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ میں امیر و غریب عالم و جاہل سب ہی شامل تھے۔ مرد تو مرد عورتوں نے بھی اس موقعہ پر غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

نتائج کے اعتبار سے بھی یہ جنگ برصغیر میں پہلی جنگ آزادی کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کو نکال باہر کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن ان کی یہ ناکامی عوام کے جذبہ حریت کو پامال نہ کر سکی۔ بیرونی اقتدار کے خلاف جذبہ روز بروز بڑھتا رہا ہے حصول آزادی کی متواتر کوششیں مختلف سمتوں میں جاری رہیں جس کا پھل بالآخر مکمل آزادی کی صورت میں ۱۹۴۷ء میں ملا۔[19]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تحریک پاکستان کی خشت اول ہے۔ جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو بڑے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ نئی نسل اپنی تاریخ کا مطالعہ اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کا عزم کرے ان خیالات کا اظہار تحریک پاکستان کے مخلص کارکن، سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان و چیئرمین نظریہ پاکستان ٹرسٹ محمد رفیق تارڑ نے ایوان کارکنان تحریک پاکستان، شاہراہ قائداعظم لاہور میں برصغیر میں برطانوی تسلط کیخلاف لڑی گئی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی اہمیت، پس منظر، واقعات اور اسکے نتائج بارے آگہی دینے کیلئے منعقدہ خصوصی نشست کے دوران اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔

اردو زبان پر ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے اثرات

جنگ آزادی کا اثر زبان پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اپنے اثرات اور عواقب کے اعتبار سے بہت دوررس ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کی ضبطی نے بہت سے ارباب بصیرت کے لیے سامان عبرت بہم پہنچایا تھا لیکن پھر بھی دلی کے لال قلعے میں جھلملاتی ہوئی شمع سے بہت سے لوگوں کی امیدیں وابستہ تھیں۔[20]

بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ تھے اور قلعہ معلیٰ کی چار دیواری میں بھی وہ اپنے قول و فعل میں آزاد نہ تھے لیکن بہادر شاہ ظفر اس کے باوجود سلطنت کی عظمت کی نشانی اور تحریک آزادی کے محور کی حیثیت سے تھے اور ان کی ذمہ داریاں بہت تھیں۔ ریاست کی بساط پر سے اٹھ جانا صرف ایک کمزور مغل بادشاہ کا خاتمہ نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک تہذیب ایک معاشرت اور ایک تمدن کا تصور وابستہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے اس تہذیب معاشرت اور تمدن کی بنیادوں پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس کے بعد انتظامی کاروائیوں نے لوگوں کے حوصلے پست کر دیئے۔

ہمارے وہ علماء جو علم و فن کے علم بردار اور ہماری تہذیب کے مظہر تھے۔ جہاد کے فتوں پر دستخط کرنے کے الزام میں پھانسی پر لٹکائے گئے اور شرفاء کا وہ طبقہ جو ہماری روایات کا وارث اور محافظ تھا قیام امن کے نام پر باغیوں کی مدد کرنے کے الزام میں ہٹادیا گیا۔ غرض اس قیام امن میں جو کچھ گزری وہ شاید ہولناک جنگوں میں بھی نہ گزری ہو گی۔ یہاں سے ہماری سیاست، تعلیم، تہذیب و معاشرت غرض زندگی کے پودے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۱۸۵۷ء کی فتح نے انگریزوں کے حوصلے بلند کر دیئے اور انہوں نے نہایت بے دردی سے ملکی روایات اور قومی امنگوں کو کچل ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا۔ زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا وار یہ تھا کہ فارسی کی تہذیبی حیثیت کو ختم کر دیا گیا، دفتروں، عدالتوں، تجارتی اور صنعتی اداروں میں فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی، جو دفتری اور عدالتی کارروائی عوام کے انگریزی سے نابلد ہونے کی وجہ سے مجبوراً اردو میں کی جاتی تھی۔[21]

اس میں بھی آہستہ آہستہ انگریزی الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے۔ پھر انگریزی اب حکمران طبقے کی زبان تھی۔ اس لیے انگریزی الفاظ کا استعمال مہذب ہونے کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح انگریزی کے جو الفاظ اردو میں آئے وہ تین طرح کے تھے پہلے وہ الفاظ جو دفتر یا عدالتی زبان سے تعلق رکھتے تھے اور جن کا استعمال خواص اور عوام دونوں کرتے تھے۔ بظاہر یہ ایسے الفاظ تھے جو آہستہ آہستہ اردو میں گھل مل کر اردو بن گئے۔

جنگ آزادی کے تعلیم پر اثرات

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ہندوستان میں جو نظام تعلیم تھا۔ اس میں مدرسے ہی کلیدی ادارے تھے۔ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی دی جاتی تھی اور صدیوں سے مسلمانوں میں ایسا ہی نظام چلا آیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے گورے اپنے تئیں اس زعم میں مبتلا ہو چلے تھے کہ انہوں نے ہندوستان پر مکمل اجارہ داری قائم کر لی ہے اور اب کسی میں دم خم نہیں کہ وہ بدیسی مضبوط حکومت کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کر سکے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد گورے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کے لیے مجبور ہو گئے۔ ہندوستان کے لوگوں کو مستقل محکوم بنانے کے لئے بہت سارے اقدامات کے ساتھ ساتھ انہوں نے سابقہ تعلیمی ڈھانچے کو تبدیل کر دیا۔ یقیناً گورے طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو زیادہ دیر تک زیر نہ رکھ سکے لیکن اپنی پالیسی کے زرو پر انہوں نے مسلمانوں کو ایسا زیر کیا ہے کہ آزادی کی ۶۳ بہاریں دیکھنے کے باوجود ہم ذہنی غلامی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ گوروں نے تمام وسائل کو انگریزی تعلیم کے واسطے مخصوص کر دیا۔[22]

انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ ہر سہولت انہیں اداروں کے لئے مخصوص کر دی اور انسی اداروں کے تعلیم یافتہ لوگوں پر نوازشات کے دروازے کھولے۔ ایسے حالات میں دین کا درد رکھنے والے حضرات نے اپنے تئیں دین کی تعلیم کا مشکل کام سنبھالا، بڑی جانفشانی اور ذاتی لگن سے دینی تعلیم والے سلسلے کو برقرار رکھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے برصغیر میں ایک نظام تعلیم تھا یعنی مدرسہ میں پہلے قرآن کی تعلیم اور اس کے بعد میں ایک نظام تعلیم تھا یعنی مدرسہ میں پہلے قرآن کی تعلیم اور اس کے بعد مختلف شعبوں کی تعلیم۔ جبکہ ۱۸۵۷ء کے بعد دو نظام تعلیم رائج ہوئے۔ ایک تعلیم۔ یہی دو نظام تعلیم آج تک انگریزی نظام تعلیم اور دوسرا اسلامی نظام تر ہمارے ملک میں چل رہے ہیں۔[23]

اب ہوتا یہ ہے کہ انگلش سکولوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والا اور پھر بیرون ممالک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا بابو جب اسلام کو دیکھتا ہے تو اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جو اسے مغربی اساتذہ نے اسلام کے متعلق زہر پڑھایا ہوتا ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ مناصب زیادہ تر انہی لوگوں کے پاس ہیں جنہیں اسلام کی الف ب کا بھی پتہ نہیں ہوتا انکو آیۃ الکرسی سنانے کا کہا جائے تو قل ھو شروع کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ جو دینی مدارس سے سند یافتہ ہوتے ہیں ان کی اکثریت مساجد اور مدارس تک محدود رہتی ہے۔ عصری تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اعلیٰ مناصب حاصل نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدارس کو حکومتی سرپرستی میں لے لیا جائے اور وہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے اور گورنمنٹ سکولوں میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ منتخب دینی کتب کی تعلیم کو ضروری قرار دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا ہر بچہ دین کے متعلق ابتدائی معلومات رکھتا ہو اور وہ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان عورت اور مرد پر فرض ہے" کے منصب سے سبکدوش ہو سکے۔[24]

بغاوت کے اثرات:

انڈیا کمپنی کے نظم ونسق کو ٹھپ کر دیا تھا۔ اس لئے سارا نظم ونسق آزادی کی اس جدوجہد نے ایسٹ انڈیا مپنی - انگلستان کی ملکہ کو منتقل کر دیا گیا۔ انتظامی ذمہ داری برطانوی پارلیمنٹ میں سکریٹری آف انڈین آفیسرں کے حوالے کی گئی۔ ۱۸۵۸ء میں برطانیہ کی رانی نے جو اعلان کیا اس اعلامیہ کو ہندوستان کا "میگنا کارٹا" قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے۔

1. ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیسی والیان سے جو معاہدے کئے تھے وہ برقرار رکھے گئے۔
2. علاقائی توسیعی منصوبے ترک کئے گئے۔
3. ہندوستان کے لئے ایک مستحکم حکومت فراہم کیا جانا قرار پایا۔
4. قانون کے تحت حکومت مساوات پر کاربند رہے گی۔
5. حکومت مذہبی معاملات میں داخل اندازی نہیں کرے گی۔

انگریزوں نے حقیقت محسوس کی کہ ہندوستانی عوم کے سہارے، بھروسے اور اعتماد کے بغیر پُرامن حکومت قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہندوستانیوں کی قوم پرستی میں جان پڑ گئی۔[25]

حوالہ جات

[1]۔ محمود الحسن، مولانا، ریشمی خطوط سازش کیس، مرتبہ سید محمد میاں، الجمعیت بک ڈپو، دہلی، س ن ص 166

[2]۔ مدنی، حسین احمد، نقش حیات، سنٹرل لائبریری الہ آباد یونیورسٹی، 1953ء، ج2، ص196-197

[3]۔ محمود الحسن، مولانا، ریشمی خطوط سازش کیس، ص196-197

[4]۔ ایضاً

[5]۔ مدنی، حسین احمد، نقش حیات، ج2، ص145

[6]۔ ایضاً

[7]۔ ایضاً، ج2، ص167

[8]۔ محمود الحسن، مولانا، ریشمی خطوط سازش کیس، ص129

[9]- www.banuri.pk/Accessed on 5 Jan, 2025

[10]- Ibid

[11]۔ درخشاں تاجور، ڈاکٹر، جنگ آزادی شخصیات، نظریات و تحریکات، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2004ء، ص88

[12]۔ ایضاً

[13]۔ قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، ترقی اردو بورڈ نئی دہلی 1978ء، ص42

[14]۔ مدنی، حسین احمد، نقش حیات، ج2، ص141

[15]۔ محمد صلاح الدین عمری، ریشمی رومال تحریک، الولی حیدر آباد، ص28

[16]۔ کرانتی کمار، ریشمی رومال سازش، ماہنامہ نیادور، ص54

[17]۔ ماہنامہ دار العلوم، شمارہ:10-11، جلد:91، نومبر 2007ء

[18]۔ ایضاً

[19]۔ زلفی شاہ، نظام تعلیم پر جنگ آزادی کے اثرات، 6مارچ 2012

[20]۔ ایضاً

[21]- www.parejeddah.org/Accessed on 14 December, 2024

[22]۔ زلفی شاہ، نظام تعلیم پر جنگ آزادی کے اثرات، 6مارچ، 2012

[23]۔ ماہنامہ دار العلوم، شمارہ:10-11، جلد:91، نومبر 2007

[24]۔ سماجی سائنس برائے جماعت دہم، حصہ اول، کارنا نکاہ ٹیکسٹ بک سوسائٹی

[25]- www.parejeddah.org/Accessed on 4 Jan, 2025